سماجی مساوات کے بعض پہلو

(زیرِ ترتیب کتاب 'اسلام - ایک نجات دہندہ تحریک' کا ایک حصہ)

______ مولانا سلطان احمد اصلاحی

بین برادری شادیاں

اسلام کی نجات دہندہ تحریک میں سماجی مساوات کے ذیل میں مختلف برادریوں کے درمیان شادیوں (Inter-caste marriages) کا مسئلہ بھی آتا ہے۔ موجودہ دور کے عالمیت (Cosmopolitanism) اور عالمی گاؤں (Global Village) کے تصورات میں اس کی لے قدرے تیز اور اس کے لیے فضا نسبتاً زیادہ ہموار ہوگئی ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ ہر طرح سے خوش آئند ہے اور ہمارے خیال میں پوری فراخ دلی سے وہ اس کا استقبال کرتا ہے[1]۔ یہ مسئلہ اندرونِ ملک بھی، بلکہ بعض اوقات بیرونِ ملک اس کی زیادہ ضرورت اور اس کے زیادہ چلن کا احساس ہوتا ہے۔ مہاجرت اور ترکِ وطن (Migration) دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ ماضی بعید میں اس کا سہرا اسلام اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمی قیادت سے جڑتا ہے۔ آج سے چودہ سو سال قبل آپؐ کی آمد پر دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلمانوں کی جس

---

[1] ہندو برادرانِ وطن۔ ملک کے تمام بڑے انگریزی اخبارات ہندوستان ٹائمس، ٹائمس آف انڈیا وغیرہ میں ہفتہ کے مخصوص ضمیمہ میں ایک حصہ شادیوں (Matrimonials) کے اشتہار کا ہوتا ہے۔ اس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں: برہمن، کھتری، گوئل، متل، گپتا، اگروال وغیرہ کی طرف سے اس مقصد کے اعلان کا ایک مستقل نوٹ ہوتا ہے کہ اس رشتہ میں ذات برادری کی کوئی قید نہیں ہے۔ (Caste no Bar) اس طرح کے کسی بھی ضمیمے میں اس کے نمونے ایک سے زائد مقام پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

طرح مہاجرت ہوئی اور مختلف مقاصد کے تحت وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل اور آباد ہوئے، دنیا کی تاریخ میں اس سے قبل اس بڑے پیمانے کی مہاجرت اور ترکِ وطن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ذرائعِ آمد و رفت کی ترقی اور معیشت اور معاشرت کے دیگر اسباب و محرکات کے تحت اس مہاجرت اور ترکِ وطن (Migration) میں ادھر قریب کے زمانے میں بڑی تیزی آئی ہے اور اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔ اس مہاجرت کے مسائل میں ایک بہت بڑا مسئلہ بین برادری شادیوں (Inter Caste Marriages) کا ہے۔ اسی طرح جتنا یہ مسئلہ غیر مسلم دنیا کا ہے، اس سے کم یہ مسلمان دنیا کا نہیں ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم کی مہاجرت اور منتقلی کے ساتھ عالمی سطح پر خود اپنے اپنے ملکوں میں دیہاتوں سے شہروں اور ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی اور مستقل قیام کا جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے آج کی اصطلاح میں شہریت پسندی کے رجحان (Urbanisation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں بیرونِ ملک منتقلی اور قیام سے کچھ زیادہ ہی بین برادری شادیاں اندرونِ ملک منتقلی اور مہاجرت کی ضرورت بن گئی ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم تو خاص خاص اور خال خال لوگ ہی منتقل اور وہاں کی سکونت اختیار کرتے ہیں۔ اندرونِ ملک کی اس منتقلی اور قیام پذیری میں عوام و خواص دونوں شامل ہیں۔ بلکہ بسا اوقات بوجوہ خواص سے زیادہ عوام کی یہ ضرورت ہوتی ہے جس کے تقاضوں سے جیسے تیسے انھیں عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ اسی میں ایک بین برادری شادی کا بھی مسئلہ ہے۔

بلا شبہ اس مسئلہ کا ایک حل یہ کہا جا سکتا ہے کہ پردیس میں آدمی اپنی برادری کو تلاش کر لے اور شادیوں کا انعقاد اسی میں عمل میں آئے۔ لیکن عملاً یہ چیز بڑی دشوار ہے۔ بسا اوقات بدلے ہوئے ماحول میں برادری کے مقابلے میں رشتے کے استحکام کے پہلو سے موافقت اور مناسبت اس سے باہر زیادہ نظر آتی ہے۔ اپنے علاقے کے اندر اگر برادری کے اندر کی شادی ہر پہلو سے مفید اور مناسب ہوتی ہے تو پردیس میں بعض اوقات یہی چیز برادری سے باہر حاصل ہوتی نظر آتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس سلسلے میں سختی نہیں ہے۔ بلا شبہ اسلام میں 'کفاءت' جوڑ کی شادی کے مسئلہ میں میل و موافقت کے دیگر اسباب و عوامل میں خاندان اور نسب کو اہم مقام

حاصل ہے[1] لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے باہر شادی اور نکاح کے لیے لچک اس کے یہاں ابتدا سے موجود ہے۔ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں ضرورت کے تقاضے کے تحت اس کے دائرے کو وسعت بھی دی جاسکتی ہے۔ شادی بیاہ میں جوڑ "کفاءت" کے مسئلہ میں خاندان اور نسب یا دوسرے لفظوں میں ذات برادری کو اہم مقام حاصل ہے، جس کے سلسلے میں حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کو ایک سنگ میل کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

لأمنعنّ فروج ذوات	میں کوئی پابندی لگانی چاہتا ہوں جس
الأحساب الامن الأكفاء[2]	سے کہ خاندانی عورتوں کی شادی ان کے جوڑ
	کے مردوں ہی سے ہوسکے۔

اس سلسلے میں ان کا دوسرا قول بھی ہے۔

لا تكرهوا فتياتكم	اپنی باعزت لڑکیوں کو زبردستی پست
على الدميم فإنهن	حیثیت کے پلّو نہ باندھو، اس لیے کہ
يحببن من ذلك	اس معاملے میں ان کو بھی وہی اچھا لگتا
ما تحبون[3]	ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

جس کی بنیاد پر فقہ حنفی میں طرفین یعنی امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے کہ عورت اپنی مرضی سے غیر کفو میں شادی کرلے جس پر اس کا ولی اس کے مقدمے کو قاضی کے پاس لے جائے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کرادی جائے گی[4] اسی طرح اس سلسلے میں نیکی اور دین داری کے اصل اعتبار کی ایک حدیث کو نقل کرنے کے بعد[5] اس کی حکمت

---

[1] ہماری کتاب محولا اسلام کا تصور مساوات، ۲۲۷

[2] امام محمد م ۱۸۹ھ: کتاب الآثار/ ۹۷، شیخ الٰہی بخش محمد جلال الدین تاجران کتب لاہور ۱۹۱۱ء۔ اس موقع پر 'اکفاء' سے مراد حسب نسب اور خاندان ہے۔ دوسری جگہ فاروق اعظمؓ کے قول میں اس کی صراحت ہے۔ لأمنعنّ فراج ذوات الأحساب الامن الأكفاء قال قلت وما الأكفاء قال: في الأحساب - ابن قدامہ المقدسی م ۶۲۰ھ المغنی لابن قدامہ: ۶/ ۴۸۲ مکتبۃ الجمہوریۃ العربیہ، مصر۔ بدون سنہ [3] دہلوی م ۱۱۷۶ھ: ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۳/ ۲۰۴، طبع کراچی، محولہ بالا

[4] کتاب الآثار، حوالہ سابق [5] جامع ترمذی کی روایت اذا خطب الیکم من ترضون دینہ وخلقہ الخ

بیان کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

ليس في هذا ان الكفاءة غير معتبرة، كيف وهي مما جبل عليه طوائف الناس وكاد يكون القدح فيها أشدّ من القتل، والناس على مراتبهم، والشرائع لا تهمل مثل ذلك، ولذلك قال عمرؓ: لأمنعنّ النساء الا من أكفائهن[1]

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شادی میں جوڑ 'کفاءۃ' کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ یہ لوگوں کے خمیر میں شامل ہے اور بسا اوقات اس کے سلسلے کی انگشت نمائی جان دینے سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لوگوں کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں اور خدا کی شریعت اس کو نظر انداز نہیں کرتی ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ کا کہنا تھا کہ: میں اس کا پورا اہتمام کروں گا کہ خاندانی عورتوں کی شادی ان کے جوڑ کے مردوں ہی سے ہو۔

لیکن شادی اور نکاح میں 'کفاءت' کے مسئلے میں اصل اعتبار اور قرآن و سنت کا اصل زور نیکی اور دین داری پر ہے، جس کی تفصیل اپنے مقام پر کی گئی ہے[2] حضرت شاہ ولی اللہؒ اس سلسلے میں ان دونوں طرح کے نصوص و آثار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے درمیان اس طرح تطبیق دیتے ہیں، جسے اس مسئلہ میں ایک طرح سے قولِ فیصل کا درجہ دیا جا سکتا ہے:

قلت وجه التطبيق أنّ الكفاءة حق الزوجة ووليها، لئلا يلزمهما العار فإن أسقطا حقّهما لرعاية مصلحة دينية فذلك محبوب

میرا کہنا ہے: تطبیق کی صورت یہ ہے کہ 'کفاءت' عورت اور اس کے ولی کا حق ہے جس سے کہ ان کی حیثیت کو بٹہ نہ لگے۔ سو اگر وہ کسی دینی مصلحت کے پیش نظر اپنا حق چھوڑنے کو تیار ہوں تو یہ ہر طرح سے پسندیدہ اور

= حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۱۲۴، طبع مذکور۔ پوری حدیث کے ترجمہ اور تخریج کے لیے ہمارا رسالہ: کمسنی کی شادی اور اسلام/۵۳ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی۔ بار اول ۱۹۹۰ء

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۲۴۔ حوالہ سابق۔

[2] اسلام کا تصور مساوات/۲۳۷

مندوب الیہ[1]		مستحسن ہے۔

یہ تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی م ۱۱۷۶ھ کی رائے ہے۔ حضرت امام شافعی م ۲۰۴ھ اس سے ہزار سال پہلے اس مسئلہ کو صاف کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں محدث دہلوی کی رائے کو ان کی صدائے بازگشت کہا جا سکتا ہے۔ 'کفاءت' کے ایک جزئیہ کی تفصیل میں اپنی شاہ کار کتاب 'الأم' میں فرماتے ہیں:

..... وإن كان الولي اقرب	قریب کا ولی عورت کی شادی اس کی
من دونه فزوج غير كفء	مرضی سے غیر کفو میں کر دے تو اس سے
باذنها فليس لمن بقي من	دور کے اولیاء کے لیے اس رشتہ کو رد
الاولياء الذي هو اولى	کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس کے
منهم رده لانه لا ولاية	ہوتے ان کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ امام
لهم معه قال: وليس	شافعیؒ مزید کہتے ہیں کہ: غیر کفو سے نکاح
نكاح غير الكفء محرمًا	کوئی حرام تو ہے نہیں جسے میں ہر حال میں
فأرده بكل حال إنما هو	رد کر دوں۔ اس سے منکوحہ اور اس کے
نقص على المزوجة و	اولیاء کو نقصان ضرور لاحق ہوتا ہے۔
الولاة فإذ أرضيت المزوجة و	لیکن جب وہ دونوں خود اس نقصان
من له الأمر معها بالنقص لم أرده[2]	کو سہنے کو تیار ہیں تو میں اس رشتہ کو رد نہیں کرتا۔

اپنی عبقریت، زباں دانی اور معلومات و مطالعہ کی وسعت کے پہلو سے حضرت امام شافعیؒ کو جو نمایاں مقام حاصل ہے، اس کی روشنی میں ان حضرات کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے جو علم و عمل کسی پہلو سے حضرت امام شافعی کی گرد کو نہیں پہنچتے ہیں، لیکن اس مسئلہ میں جزئیات پر جزئیات کے اضافے اور غیر ضروری فقہی غلو سے تفریق بین المسلمین کے بڑے گناہ کے موجب بنتے ہیں، مزید اس آئینے میں ان کو اپنی تصویر

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۳/۷۰۴ طبع کراچی

[2] محمد بن ادریس الشافعی م ۲۰۴ھ: الام: ۵/۱۵، دار المعرفۃ، بیروت، نگرانی و تصحیح: محمد زہری النجار من علماء الازہر، طبع جدید، بدون سنہ

اس لیے بھی دیکھنی چاہئے کہ وہ اپنا فکری سلسلۂ نسب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے ملاتے ہیں جو اس مسئلہ میں حضرت امام شافعیؒ کے ہم زبان ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے وابستگی اور ان سے انتساب کو اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس مسئلہ میں وہ جارحانہ اور دلآزار نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں، جو یقیناً حضرت شاہ صاحب کے موقف سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔[۱]

اسلام کا اس سخت گیری اور غلو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلا شبہ عام حالات میں وہ شادی بیاہ کے معاملے میں کفاءت کے دیگر عوامل کے ساتھ خاندان اور نسب کو بھی اس کا جائز مقام دیتا ہے لیکن اسلام کی آفاقیت اور تقویٰ اور دین داری کی اس کے نزدیک جو اہمیت ہے اس کے پیشِ نظر بین برادری شادیوں کے لیے اس کے یہاں پوری گنجائش موجود ہے، جب کہ بعض حالات میں حضرت شاہ صاحب کے لفظوں میں اس طرح کی شادی اور رشتہ جائز سے آگے مندوب ومستحسن قرار پاتا ہے، جیسے اپنی پسندیدہ رائے کے طور پر ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔[۲]

مناصب اور عہدوں کی اہلیت

اسلام میں جس طرح حالات ومصالح کے تحت بین برادری شادیوں کی گنجائش ہے، اسی طرح اس کا سماجی مساوات کا نکھرا ہوا تصور اسلامی معاشرہ میں مناصب اور عہدوں کو کسی خاص طبقے اور قبیلے کے دائرے میں محدود نہیں کرتا۔ اسلامی اجتماعیت میں جو شخص کسی عہدے اور منصب کے لیے مطلوبہ صلاحیت کا حامل ہو اور اس کے تقاضوں سے بہتر طریقے سے عہدہ برآ ہو سکتا ہو، اس کو یہ عہدہ اور منصب لازماً ملے گا اور ذات اور برادری کی کسی تفریق کی بنیاد پر اسے اس سے محروم نہیں

---

[۱] اس کے ایک جائزے کے لیے نوجوان اسکالر اور عالم دین مولوی مسعود عالم فلاحی کے سلسلۂ مضامین پر ایک نظر ڈالی جا سکتی ہے جس کی قسطیں زندگی نو نئی دہلی، آثار جدید مئو، اور ابلاغ ممبئی وغیرہ میں شائع ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اس کتاب کی جلد اشاعت سے اس سے مثبت فائدہ اٹھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

[۲] اسلام کا تصورِ مساوات ۲۳۹/، محولہ بالا۔

کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں اسلام کی مثالی تاریخ کا کردار بہت روشن ہے۔ اسلام ایک نجات دہندہ تحریک ہے۔ اس کے قدم جہاں کہیں جمیں گے، جہاں کہیں اس کی پذیرائی ہو گی اور اس کا بول بالا ہوگا، وہ اپنے اس تاریخی کردار کو دہرانے سے نہیں چوکے گی۔ دفتر، کارخانے، پنچایت، میونسپلٹی، ڈاکخانہ، ریلوے، عدلیہ، فوج سے لے کر وزارتِ عظمیٰ اور صدرِ ریاست کے عہدے تک اس سلسلے میں کوئی فرق اور امتیاز نہ ہوگا اور قابلیت اور اہلیت کی بنیادی شرط کو پورا کرتے ہوئے قوم، قبیلے اور ذات برادری کی بنیاد پر کسی کو اس کے جائز منصب سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام کا موقف اس سلسلے میں بہت واضح ہے: ارشاد ہے:

وَنُرِيدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى	اور ہمارا چاہنا ہے کہ ہم زمین میں دبائے
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ	ہوئے لوگوں پر احسان کریں اور ان کو حکمراں
وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ	بنائیں اور ان کو (زمین کا) وارث بنائیں اور
الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى	(خاص معاملے میں مصر کی) سرزمین میں ان کو
الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَ	اقتدار بخشیں اور فرعون، ہامان اور ان کے
هَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ	لشکریوں کے دلوں میں ان (مظلوموں) کا
مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝	جو ڈر بیٹھا ہوا تھا، اسے ان کے سامنے سچ
(قصص: ۵-۶)	ہوتا ہوا دکھا دیں۔

اپنے وقت کے سب سے بڑے ظالم فرعون کے پنجۂ استبداد میں کسی ہوئی بنی اسرائیل قوم کے بارے میں ان آیاتِ کریمہ میں جو بات کہی گئی ہے، قیامت تک اس سلسلے میں اسلام کا یہی موقف ہوگا اور یہی اس کی پسند اور ترجیح ہوگی۔ اس کے ذریعہ سے سماج کے کمزور اور دبے اور کچلے ہوئے طبقات کو اوپر اٹھایا جائے گا اور وقت کے اقتدار میں ان کو بھرپور طریقے پر شریک کیا جائے گا۔ چھوٹے اور معمولی ہی نہیں، کلیدی اور اہم ترین مناصب کو بانٹے گئے اور مظلوم لوگوں کے حوالہ کیے جائیں گے۔ بلا لحاظ اس کے کہ ان کی ذات اور برادری کیا ہے اور وہ کس قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کوئی اشکال ہو تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے رفع ہو جاتا ہے۔

اسمعوا و اطيعوا وان استعمل   سنو اور بات مانو اگرچہ تمہارے اوپر کوئی

علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ[1] — حبشی غلام ہی کیوں نہ حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح (چھوٹا) ہو۔

جس کا عملی نفاذ خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اس طرح ہوا کہ مکہ پر ان کے مقرر کردہ گورنر حضرت نافع بن عبد الحرثؓ نے ایک موقع پر اپنی عدم موجودگی میں ایک آزاد کردہ غلام عبد اللہ بن ابزی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے استفسار پر جب انھوں نے ان کے متعلق یہ تفصیل پیش کی کہ وہ قرآن کے بڑے قاری اور فرائض کے عالم ہیں انہ لقاری لکتاب اللہ وعالم بالفرائض تو اس پر حضرت عمرؓ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے حوالہ سے اپنے گورنر کے اس اقدام کی شاندار لفظوں میں تائید اور توثیق کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی یہ تھا۔

اِنّ اللہ یرفع بھٰذا الکتاب أقواما ویضع بہ آخرین[2] — اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کو بام عروج پر لے جائے گا اور دوسرے لوگوں کو زمین پر دے مارے گا

ان تعلیمات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ وطنِ عزیز میں اس سلسلے میں ملازمتوں میں رزرویشن کی پالیسی اس مقصد میں معاون ہو تو اسلام اس کی بھرپور تائید اور حمایت کرتا ہے۔ شرط یہی ہے کہ افراط اور تفریط سے بچا جائے اور ایک ظلم کے ازالہ کے لیے دوسرے ظلم کا ارتکاب نہ ہونے پائے[3]

---

[1] مسند احمد: ۳/۱۱۴، میمنیہ، مصر نیز صحیح البخاری جلد ۴۔ کتاب الاحکام، باب السمع والطاعۃ للامام مالم یکن معصیۃ، طبع جدید، المکتبۃ السلفیہ، القاہرہ۔ سر کا چھوٹا ہونا عربوں کے لحاظ سے نقص ہے۔ حدیث میں یہ بات اسی پہلو سے ہے۔

[2] اسلام کا تصورِ مساوات/۲۲۴۔ جہاں اسی بحث میں اسی سلسلے کے دوسرے واقعات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی مقام پر مسلم شریف کی حدیث محولہ کا پورا حوالہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

[3] اس موقع پر کسی مخصوص پیشے کی وجہ سے عقل کی کمزوری اور اس کی بنیاد پر عہدے اور منصب کے لیے عدم اہلیت کی دلیل میں اگر "عقل الحائک فی الدبر" (بنکر کی عقل اس کی سرین میں ہوتی ہے) جیسا حوالہ پیش کیا جائے تو اس کے ساتھ ہی ابو عثمان عمرو بن جاحظ م ۲۵۵ھ کے نقل کردہ اس محاورے کو بھی پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے کہ: الحمق فی =

ذات اور پیشے کی علاحدگی

لیکن اسلام کی نجات دہندہ تحریک کا یہ مقصد اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا کہ ذات اور پیشے الگ الگ کر دیئے جائیں۔ ذات اور پیشے کی یکجائی، بلکہ پیشے کی بنیاد پر ذات اور برادری کی تشکیل، اسے برصغیر ہند کی معاشرت کی خصوصیت کہنا چاہیے۔ صدرِ اسلام میں عرب میں برادری اور پیشے کی یہ یکجائی نہ تھی۔ بعد کے زمانہ میں بھی فقہِ اسلامی میں اسے اسی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ اسی لیے ہمارے یہاں 'کفارت' جوڑ کی شادی کے مسئلہ میں خاندان اور پیشے کو الگ الگ رکھا گیا ہے[1]، جس سے یہ اپنے آپ نکلتا ہے کہ خاندان اور برادری کے اتحاد کے باوجود پیشوں کی علٰحدگی سے کفارت کی اہلیت میں فرق آجاتا ہے۔ ایک ہی ذات اور برادری کا آدمی اتفاق سے کسی پست پیشے سے وابستہ ہو تو اس برادری کے اعلیٰ پیشہ شخص کا وہ کفو باقی نہیں رہتا۔ یا یہ کہ کم از کم اس پہلو سے اس پر سوالیہ نشان لگ جاتا اور اس کی اہلیت زیرِ گفتگو آجاتی ہے۔ برِصغیر ہند کے پس منظر میں اس سلسلے میں صورتِ حال مختلف ہے۔ یہاں پیشہ ور برادریوں کا طاقت ور سلسلہ ہے اور اسی کی بنیاد پر ان کی شناخت اور پہچان قائم ہوتی ہے۔ خاندان اور نسب کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ آدمی کا جو پیشہ ہے وہی اس کی خاندانی اور نسبی شناخت کا ذریعہ ہے۔ اس پس منظر میں سماج میں عزت، احترام اور طاقت کے حصول کے لیے ذات اور پیشے کی علٰحدگی ضروری ہے، ورنہ کم سے کم یہ کہ انھیں لازم اور ملزوم نہ رہنے دیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ نسل در نسل سے کسی خاندان میں جو پیشہ چلا آتا ہے اس کی اس سے طبعی مناسبت ہو جاتی ہے متعلق افراد

= الحاكة والمعلمين والغزالين (ناسمجھی اور نادانی بنکروں، استادوں اور سوت سازوں کی خاصیت ہے) البیان والتبیین: ۱/۲۲۹، مصر ۱۳۶۶ھ، طبع ثالثہ۔ ان باتوں کا کوئی خاص پس منظر ہو سکتا ہے، ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ مدرسہ کے استاد اور کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر احمق ہوتے ہیں۔ اسی طرح بنکری اور سوت سازی سے وابستہ افراد کو علی الاطلاق ناسمجھ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

[1] اسلام کا تصورِ مساوات / ۲۳۷

کو اس میں جلد مہارت اور دستگاہ حاصل ہو جاتی ہے، جو اس سے باہر کے کسی شخص کے لیے بہت دیر میں اور بہت مشکل سے حاصل ہو پاتی ہے۔ پیشے بہر حال انسانی معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہیں۔ فطری اور سہج انداز سے ان میں جس طرح مہارت اور کمال حاصل ہو یہ ہر طرح مطلوب اور مستحسن ہے۔ حجام اور دھوبی، ان سے آگے بھنگی اور حلال خور جیسے افراد ہیں جو بظاہر انتہائی دنی اور پست پیشوں سے متعلق ہوتے ہیں، اپنے پیشوں سے جو مناسبت اور ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے، وہ ان کی برادریوں سے باہر کے آدمی میں پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ اس سے سماج اور انسانیت کی بہت ساری مصلحتیں بھی وابستہ ہیں کہ مسلمان ہوں کہ غیر مسلم، ان کی جو پیشہ ور برادریاں ہیں، وہ غالب ترین طور پر اپنے روایتی اور موروثی پیشوں سے وابستہ رہیں۔ پیشوں کے غیر ضروری تبادلے اور ان میں غیر متعلق اور اجنبی افراد کی آمد سے پیشہ ورانہ بحران پیدا ہوگا اور سماج اور معاشرہ خواہ مخواہ کے لیے نوع بہ نوع مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوگا۔ اس لیے کم از کم برصغیر ہند اور دنیا کے اس جیسے ممالک اور علاقے، جہاں کے معاشرتی احوال اس سے ہم آہنگ ہوں، ان کے لیے ہر طرح سے قرین مصلحت اور موزوں اور مناسب ہے کہ پیشہ ورانہ برادریاں عام طور پر اپنے اپنے پیشوں سے جڑی رہیں اور بلاوجہ ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں منتقلی سے خواہ مخواہ کا سماجی اور معاشرتی بحران پیدا نہ ہو۔

لیکن برادری اور پیشے کے اس اتحاد و یکجہتی کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک پیشے کا فرد اٹوٹ طور پر اسی پیشے سے وابستہ رہے اور سماج میں کسی اچھے مقام اور اعلیٰ عہدے اور منصب کا کبھی اس کے دل میں خیال نہ آئے۔ جب کہ اپنی فطری صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ اس کے لیے پوری طرح سے اہل ہو اور تعلیم و تربیت کے مناسب موقعوں کی فراہمی سے بہت آسانی سے اسے اس جگہ پر لایا جاسکتا ہو۔ اسلام اسی توازن کو بحال کرنا چاہتا ہے۔ بلاوجہ کی ایک پیشہ سے دوسرے پیشے کی طرف منتقلی سے سماجی بحران پیدا ہو اور نہ کسی کا موروثی پیشے سے ایسا ناگزیر التزام ہو کہ ضرورت اور اہلیت کی تمام شرطیں پوری کرنے کے باوجود وہ اس سے باہر نکلنے کا اپنے دل میں خیال نہ لاسکے۔ مخصوص مستثنیات سے ہٹ کر اصولی طور پر اسلام پیشوں

کی عزت کرتا اور ان کی قدر افزائی کرتا ہے۔ لوہاری، بڑھئی گیری اور درزی گیری انبیائی روایت ہے جیسا کہ معروف روایت کے مطابق حضرت آدمؑ کسان اور حضرت نوحؑ اور حضرت زکریاؑ بڑھئی، حضرت ادریسؑ درزی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کاشتکار اور حضرت صالحؑ تاجر پیشہ تھے۔ بعد کے زمانہ میں حضرت سلیمانؑ چٹائی بُنتے اور ان کے والد گرامی حضرت داؤدؑ زرہ بناتے اور دونوں کی روزی روٹی اپنے انہی پیشوں سے چلتی تھی۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ بکریاں چراتے تھے، جس کا شرف آخری پیغمبر فداہ ارواحنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں بھی آیا۔[1] ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ چمڑے کی دباغت اور جوتے گانٹھنے کا کام کرتی تھیں[2] جس سے ان کی اچھی آمدنی تھی اور وہ راہِ خدا میں دل کھول کر خرچ کرتی تھیں۔[3] اسی طرح ام المومنین حضرت

---

[1] حافظ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی م ۵۹۷ھ: نقد العلم والعلماء المعروف بہ تلبیس ابلیس/ ۲۰۰-۲۰۱، مطبعۃ السعادۃ مصر طبعہ اولیٰ ۱۳۴۰ھ، زیر اہتمام محمد امین الخانجی اور محمد منیر الدمشقی۔ مزید ملاحظہ ہو ہماری کتاب: اسلام کا تصورِ مساوات، ۱۰۳، ۱۰۴، زیر عنوان: پیشہ وحرفت، جہاں اس کے تفصیلی حوالے ہیں۔

[2] ابن حجر م ۸۵۲ھ: الاصابۃ فی تمییز الصحابہ: ۴/۳۱۴، مطبعۃ السعادہ، مصر، طبعہ اولیٰ ۱۳۲۸ھ۔ اس موقع پر اصل الفاظ ہیں: فکانت تدبغ وتخرز 'دباغت چمڑا اچھانا اور خرز' چمڑا سلنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے موچی کو 'خرّاز' کہا جاتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کا ترجمہ مطلق 'سلائی' سے کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

[3] الاصابہ، حوالہ سابق: ۴/۳۱۳-۳۱۴۔ نیز ابو عمر یوسف بن عبدالبر القرطبی م ۴۶۳ھ: الاستیعاب فی أسماء الأصحاب' علی ھامش الإصابہ: ۴/۳۱۵-۳۱۶، محولہ بالا۔ ابن اثیر الجزری م ۶۳۰ھ: اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہؓ: ۷/۱۲۶، طبع جدید، مکتبہ ابن تیمیہ، الشعب، ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء، تحقیق و تعلیق: محمد ابراہیم البنّا اور محمد احمد عاشور، مزید ملاحظہ ہو: ابن سعد م ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد، ۸/۱۰۸، دار صادر بیروت، ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء

اس کے علاوہ حضرات صحابہؓ میں دوسرے لوگ بھی تھے جو دندان سازی، لوہاری، بڑھئی گیری، درزی گیری اور بنکری جیسی صنعتوں اور پیشوں سے جڑے ہوئے تھے جس کی تفصیلات کہیں اور نہیں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ صحیح بخاری: ۲/۴۰۴-۴۰۸، کتاب البیوع، باب ذکر القین والحداد تا باب النجار، طبع جدید، المطبعۃ السلفیہ و مکتبتہا، القاہرہ، طبع اولیٰ ۱۴۰۰ھ۔ اسی کتاب میں اس سے پہلے انہی حضراتؓ کے بارے میں عام طور پر صراحت ہے کہ وہ اپنے گھر کے کام اور تجارت اور زراعت کے علاوہ مختلف طرح کے ہنروں اور پیشوں میں لگ کر محنت

ام سلمہؓ چمڑے کی دباغت کرتی تھیں۔ اپنے شوہر ابوسلمہؓ کی وفات کے بعد عدت ختم ہونے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے پاس نکاح کا پیغام لے کر گئے تو وہ اپنے اسی کام میں مصروف تھیں۔ مسند احمد میں اس کی تفصیلات کے ضمن میں ہے :

.... فلما انقضت عدّتی استأذن علیّ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و أنا أدبغ إهابا لی فغلست یدی من القرظ و أذنت لہ الخ[1]	.... تو جب میری عدت ختم ہو گئی تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے (پیغام نکاح کے لیے) میرے یہاں آنے کی اجازت طلب کی۔ اس وقت میں اپنا ایک چمڑا سکھا رہی تھی تو میں نے سلم کے پتوں[2] سے اپنے ہاتھ

محنت کرتے تھے۔ کان أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمّال أنفسهم الخ اسی موقع پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے پیشے کا بھی تذکرہ ہے جس سے وہ خلافت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ صحیح بخاری : ۱/ ۸۰، طبع مذکور۔ کتاب البیوع، کسب الرجل وعملہ بیدہ، دوسری جگہ اس کی تفصیل ہے کہ یہ بزّازی کا پیشہ تھا اور خلیفہ ہو جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اپنے سر پر کپڑے کا گٹھر لے کر نکلے تھے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ اور حضرت عبیدہ بن الجراحؓ کی ان سے اسی حال میں ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے انھیں اس سے منع کیا اور خلیفۂ وقت کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر ہونے کی روایت قائم ہوئی۔ فتح الباری : ۴/ ۳۰۵ طبع جدید، توزیع دار الباز بمکۃ المکرمۃ۔ اس سے پہلے حافظ ابن جوزی م ۵۹۷ھ کے یہاں بھی حضرت صدیق اکبرؓ کے کپڑے کی تجارت اور اس واقعہ کا تذکرہ ہے، مزید براں اس سے اوپر حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ حضرات عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ رضی اللہ عنہم کے سلسلے میں صراحت ہے کہ یہ سب کے سب کپڑا فروشی (بزّازی) کا کام کرتے تھے۔ اسی طرح عشرۂ مبشرہ کے حضرت زبیر بن العوامؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت عامر بن کریز بھی کپڑا سازی کی صنعت سے وابستہ تھے۔ عشرۂ مبشرہ کے دوسرے فرد حضرت سعد بن وقاصؓ تیر بناتے اور حضرت عثمان بن طلحہ درزی کا کام کرتے تھے۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے امام حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ م ۱۵۰ھ کی کپڑے کی صنعت سے وابستگی معروف ہے ہی جس کا اس مقام پر بھی تذکرہ ہے۔ ملاحظہ ہو حافظ موصوف کی مشہور زمانہ کتاب نقد العلم والعلماء المعروف بہ تلبیس ابلیس / ۳۰۱ مکتبۃ السعادہ مصر ۱۳۴۰ھ، طبع اولیٰ۔ محولہ بالا۔

[1] مسند احمد : ۴/ ۲۷-۲۸، میمنیہ، مصر

[2] ق اور ر کے زبر کے ساتھ 'قَرَظ' سلم یعنی کیکر جیسے درخت کا پتہ جس سے چمڑا سکھانے کا کام لیا جاتا ہے =

کو دھویا اور آپ ﷺ کو اندر آنے کی اجازت دی

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی زینبؓ بھی اپنے غریب شوہر اور اپنے یتیم بھتیجوں پر دل کھول کر خرچ کرتی تھیں، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کے پاس ہاتھ کا ہنر تھا، جس سے ان کی بہت اچھی آمدنی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر صراحت ہے:

قال وكانت صناع اليدين [1]	راوی کا کہنا ہے کہ ایسا اس لیے تھا کہ ان کو ہاتھ کا ہنر آتا تھا۔

آدمی ہاتھ کے ہنر سے کمائے، اس سے خود کمائے اور دوسروں پر صدقہ وخیرات کرے، اسے بہت بڑی نیکی قرار دیا گیا ہے۔

على كل مسلم صدقة	ہر مسلمان پر کوئی نہ کوئی صدقہ عائد ہوتا ہے،
..... يعتمل بيديه فيأكل	.... آدمی اپنے ہاتھ کی محنت سے کمائے،
منه ويتصدق [2]	اس سے خود کھائے اور راہِ خدا میں صدقہ وخیرات کرے (یہ بھی اس صدقہ کو اتارنے کی ایک صورت ہے)۔

= واحد: قرظة۔ اس موقع پر اس کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں کہ بچھانے کی ضرورت سے سلم کے جو پتے ہاتھ میں لگے ہوئے تھے ان کو دھو کر صاف کیا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلم کے نئے پتوں سے ہاتھ کو اچھی طرح دھو کر صاف کیا جس سے کہ اس کی مہک کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ واللہ اعلم۔ لغت کی اس مشکل کے حل کے لیے مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کی 'مصباح اللغات' ہمارے پیش نظر ہے۔ مطبوعہ خلیلیہ کتب خانہ' لال باغ ڈھاکہ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء

[1] سنن ابن ماجہ، ابواب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ علی ذی قرابۃ ص ۱۳۳۔ طبع قدیم مجتبائی۔ دہلی۔ یہ زینب صحابیہؓ عبداللہ بن معاویہ ثقفی کی صاحب زادی ہیں۔ ان سے ان کے شوہر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علاوہ حضرت ابوسعیدؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ نے بھی روایت کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ کے علاوہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی ان سے احادیث ہیں۔ دیکھئے: الخطیب التبریزی م ۷۴۲ھ: الکمال فی اسماء الرجال ملحقاً بآخر المشکوٰۃ / ۵۹۶، رشیدیہ دہلی۔

[2] سنن الدارمی ۲/ ۱۳۹۹، کتاب الرقائق، باب علی کل مسلم صدقہ۔ طبع جدید دار الریان للتراث القاہرۃ طبعہ اولی ۱۴۰۷ھ / ۱۹۸۷ء محقق ایڈیشن

قرآن وسنت کے دوسرے نصوص اس کے حق میں اس کے علاوہ ہیں[1]۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ ارشاد بھی بڑا قابلِ توجہ ہے

ان اللہ تعالیٰ یحب العبد المحترف[2]	اللہ تعالیٰ ہنرمند بندے کو دل سے عزیز رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں اس سے پہلے ان کے والد گرامی حضرت فاروق اعظمؓ کا عملی نمونہ بھی دلچسپی کا ہے، جن کا حال یہ تھا کہ کسی نوجوان کو اگر وہ ہنرمندی سے خالی پاتے تو وہ ان کی نگاہ سے گر جاتا تھا۔ اس سے متعلق ان سے روایت کے الفاظ ہیں:

عن محمد بن عاصم	محمد بن عاصم کی روایت ہے کہتے ہیں
قال: بلغنی ان عمر بن	کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن
الخطاب رضی اللہ عنہ	خطابؓ جب کسی نوجوان کو دیکھتے جس
کان اذا رأی غلاما	کے اندر کوئی جوہر نظر آتا تو وہ اس سے
فأعجبه سأل عنه هل	دریافت کرتے کہ کیا اسے کوئی ہنر بھی
له حرفة فان قیل	آتا ہے۔ اس کا جواب اگر نفی میں ملتا تو
لا قال سقط من عینی[3]	فرماتے کہ یہ شخص میری نگاہ سے گر گیا۔

اس تفصیل سے بخوبی واضح ہے کہ اسلام پیشے اور حرفت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ عام طور پر وہ اسے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس سلسلے میں برصغیر ہند کا آج سے پہلے کا دور جاگیرداری وزمین داری کا یہ عرف اسلام کے مخالف اور اصلاح طلب تھا جس میں باہر کی ہی نہیں مسلمانوں کی پیشہ ور برادریوں کو بھی ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا، بلکہ اس سے آگے خود ان پیشوں کو ہی حقیر اور ذلیل سمجھا گیا، جس کے آثار کچھ نہ کچھ آج بھی اونچی مسلمان غیر پیشہ ور برادریوں میں موجود ہیں۔ جس طرح خاندانی پیشہ کی دنارت کے باوجود ایک شخص

---

[1] ہماری کتاب "اسلام کا تصور مساوات" زیر عنوان: پیشہ وحرفت ص ۱۰۱ اور اس سے آگے۔

[2] المناوی: التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/۲۷۰، دار الطباعۃ العامرہ، مصر ۱۲۸۶ھ

[3] ابن الجوزی: نقد العلم والعلماء/۳۰۲، مطبع السعادۃ، مصر، محولہ بالا۔

اچھا انجینیر یا ڈاکٹر ہو تو سیکولر معاشرے اور سیکولر ریاست میں اسے نوکری اور ملازمت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی سماج اور معاشرے میں اس کو اس سے بڑھ کر اس کا جائز مقام اسے ملے گا اور صلاحیت اور اہلیت کی شرط کے ساتھ کسی پست سے پست پیشے سے وابستگی اس کے استحقاق کے لیے مزاحم اور حارج نہ ہوگی۔ اپنی اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر علم و تقویٰ سے آراستہ ہو کر جس طرح وہ بڑے سے بڑا سرکاری ڈاکٹر اور انجینیر ہوگا، اسی طرح وہ اسلامی عدالت کا بڑے سے بڑا قاضی اور اس کی جامعہ کا مفتی اعظم اور شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر ہوگا۔ اس سلسلے میں ماضی کے اشرافی عرف کی بنا پر کچھ رکاوٹ تھی بھی تو آج کے جمہوری عوامی عرف میں اس کا راستہ بالکل صاف ہے اور کسی نقصان اور ردِّ عمل کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ذات اور پیشہ لازم اور ملزوم نہ رہے۔ اسلام نے جو راہِ اعتدال دکھائی ہے اس سے یہ مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں 'ورن و وستھا' کی ہمارے یہاں جو روایت تھی اگر وہ اعتدال کی حد تک رہے تو اس میں حرج نہیں ہے۔ لیکن فرد کو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے اور ترقی کے مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ ذات اور آبائی پیشہ کو اس میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اس سلسلے میں ماضی میں اسلام کا جو تاریخی کردار رہا ہے، آج بھی سماج اور انسانیت کو اس کے اس کردار کی ضرورت ہے۔ ماضی میں ہند و بیرونِ ہند میں جب اس نے غلاموں کو حکومت و اقتدار کے ایوانوں میں بٹھایا ہے[1] تو اس سے نچلے درجے کے عہدوں اور منصب کے لیے آج کے دبے ہوئے اور محروم طبقات کے اہل اور مستحق ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہند و بیرونِ ہند طاقت اور اقتدار کے مراکز میں ان طبقات کی نمائندگی کی جو تحریک ہو اعتدال و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسلام بطور نوعِ انسانی کی نجات دہندہ تحریک کے اس کی تائید و حمایت کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے معاون دائرے میں اگر ذات اور پیشوں کی علٰحدگی ضروری ہو تو وطنِ عزیز کے پس منظر میں وہ اس کا بھی اسی طرح طرف دار اور حمایتی ہے۔

---

[1] اسلام کا تصورِ مساوات ص ۲۲۹ - ۲۳۳ زیرِ عنوان 'غلامی' حوالہ بالا۔